علامہ اقبال اور مولانا اسلم جیراج پوری

جعفر بلوچ

'اہل قرآن' کے نام سے شہرت پانے والوں میں مولانا اسلم جیراج پوری کا نام بھی شامل ہے۔ البتہ ان کا ذاتی خیال یہ سامنے آیا ہے کہ میں اہل قرآن میں سے نہیں ہوں۔ مولانا اسلم ایک علمی شخصیت ہونے کے ناتے اپنا ایک نقطۂ نظر رکھتے تھے جس کا اظہار انھوں نے مختلف علمی مسائل میں کیا۔ علامہ اقبال کی شعری تخلیقات پر ان کی عالمانہ آرا موجود ہیں۔ علامہ سے ان کی مراسلت بھی رہی۔ علامہ کے بعض شعری مجموعوں پر انھوں نے اپنے اختلافات اور تحفظات کا اظہار بھی کیا تاہم وہ کلام اقبال کو اپنے لیے غذائے روح قرار دیتے تھے اور اقبال کو دیگر سب شعرا سے افضل تر سمجھتے تھے۔ زیرِ نظر مقالے میں علامہ اقبال کے کلام نثر و نظم کے حوالے سے مولانا اسلم کی علمی اور تنقیدی آرا کو مربوط صورت میں پیش کیا گیا ہے جس سے مولانا اسلم کی اقبال سے عقیدت اور خود مولانا کے بارے میں بھی بہت سی تہیں کھلتی ہیں۔

مولانا محمد اسلم جیراج پوری (جنوری ۱۸۸۳ء، جے پور، ضلع اعظم گڑھ - ۲۸ دسمبر ۱۹۵۵، دہلی) کے نام اور علمی کارناموں سے اہل ادب ناآشنا نہیں۔ انھوں نے اسلام، قرآن اور اسلامی تاریخ کے حوالے سے گراں قدر دینی اور علمی و ادبی خدمات سرانجام دی ہیں۔ ان کی بعض تصانیف مثلاً تاریخ الامت، نکات قرآن، علم المیراث، تاریخ التمدن الاسلامی (ترجمہ)، تاریخ نجد اور نوادرات وغیرہ شہرہ آفاق ہیں اور اسلامی دنیا کی کئی علمی اور تہذیبی ضروریات کو پورا کرنے والی ہیں۔ چنانچہ یہ کتابیں بار بار چھپتی رہتی ہیں۔

مولانا جیراج پوری کا شعری ذوق بھی بہت اعلیٰ تھا۔ وہ فنِ شعر کے اسرار و رموز سے بخوبی آگاہ تھے۔ علامہ اقبال کی بعض تصانیف پر ان کے تبصروں سے ان کے ذوقِ شعر کی بلندی اور ان کی ناقدانہ بصیرت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ان کا ایک مختصر مجموعۂ منظومات بھی جواہر ملیہ کے نام سے شائع ہوا تھا۔

مولانا جیراج پوری میں یہ قابل رشک علمی و دینی بصیرت اور مجتہدانہ نقطۂ نظر پیدا کرنے کا سہرا ان

کے والد ماجد مولانا سلامت اللہ (۱۸۵۶ء-۱۵ جون ۱۹۰۴ء) کے سر ہے، جو خود بھی اپنے زمانے کے ایک ممتاز عالمِ دین تھے اور نواب صدیق حسن خاں کے زمانۂ اقتدار میں بھوپال کے محکمۂ تعلیمات کے مہتمم رہے تھے۔ مولانا جیراج پوری پیسہ اخبار لاہور کی ملازمت چھوڑ کر (۱۹۰۴ء) علی گڑھ کالج میں پروفیسر ہوگئے تھے۔ پھر دینی اور ملّی جذبے کے تحت وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بطور استادِ اسلامیات وابستہ ہوگئے اور تاحیات اسی ادارے سے منسلک رہے۔

شاہ معین الدین احمد ندوی مدیر معارف اعظم گڑھ نے مولانا اسلم جیراج پوری کی وفات پر لکھا تھا:

> مرحوم صاحبِ علم ونظر عالم تھے۔ اگرچہ ان کی تعلیم پُرانے (تعلیمی نظام) اور پھر اہلِ حدیث کے ماحول میں ہوئی تھی لیکن وہ بڑے روشن خیال اور زمانہ کے حالات و رجحانات سے باخبر تھے اور کسی سوسائٹی میں اجنبی نہیں معلوم ہوتے تھے..... مسلکاً اہلِ قرآن کی طرف مائل تھے مگر منکرینِ حدیث کی طرح غالی نہ تھے۔ سنتِ متواترہ کو مانتے تھے۔ عملاً دیندار اور طبعاً بڑے سادہ، متواضع اور خلیق تھے۔[1]

اہلِ قرآن سے مولانا اسلم جیراج پوری کا تعلق تو بلا شبہہ رہا ہے اور جناب غلام احمد پرویز انھیں اپنا استاد بھی تسلیم کرتے تھے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مولانا خود اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ انھیں اہل قرآن میں شمار کیا جائے۔ چنانچہ جناب عبدالعزیز کمال کے نام اپنے ۱۲/اپریل ۱۹۵۱ء کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

> میں جماعت اہلِ قرآن میں سے نہیں ہوں۔ وہ لوگ عملِ متواتر کے قائل نہیں ہیں۔ اور نماز و روزہ وغیرہ کے لیے اپنی اختراعی شکلیں نکالتے ہیں اور میں رسول اللہؐ کے اسوۂ حسنہ کو جو اُمت میں سلسلہ بہ سلسلہ نسلاً بعد نسل چلے آتے ہیں، دینی اور یقینی مانتا ہوں۔ حدیثیں یقینی نہیں ہیں بلکہ ظنی ہیں۔ وہ دینی نہیں ہیں بلکہ تاریخی حیثیت رکھتی ہیں..... طلوع اسلام کا اپریل (۱۹۵۱ء) کا شمارہ اقبال نمبر ہے۔ نیز وہ کبھی کبھی میرے مضامین بھی چھاپتا رہتا ہے۔[2]

مولانا جیراج پوری دین و ادب کے متنوع دوائر میں امامت کے منصب پر فائز تھے۔ اقبالیات بھی دین وادب ہی کا ایک سعادت آگیں شعبہ ہے۔ مولانا اس طرف بھی متوجہ ہوئے اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا اپنی جودتِ فکر ونظر کے باعث اقبالیاتی ادب کا بھی ایک محکم حوالہ ہیں۔

حضرت علامہ اقبال سے مولانا کا غائبانہ تعارف تو غالباً ان کے زمانۂ طالب العلمی سے ہوگا حضرت علامہ سے ملاقات کا شرف ممکن ہے انھیں ۰۴-۱۹۰۳ء میں حاصل ہوا ہو۔ ان دنوں مولانا عربی مضامین اور خبروں وغیرہ کے مترجم کے طور پر پیسہ اخبار لاہور سے وابستہ تھے۔ لیکن تاحال ایسی کسی ملاقات کی تحریری یا زبانی شہادت دستیاب نہیں ہوئی۔ اس کے بعد بھی کئی ایسے مواقع آئے جب حضرت علامہ سے مولانا کی ملاقات ہوسکتی تھی۔ مثلاً حضرت علامہ ۱۹۳۳ء میں غازی رؤف پاشا (ترکی) کے لیکچروں کی صدارت کے

سلسلے میں ۱۸ سے ۲۱ مارچ تک دہلی میں رہے۔ اسی طرح ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی درخواست پر حضرت علامہ ۵/اپریل کو پھر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں تشریف لے گئے اور اسی روز جامعہ میں جلسہ ہوا۔ افسوس ہے کہ ان مواقع پر بھی ان اکابر کی باہمی ملاقات کی کوئی خبر ہم تک نہیں پہنچی۔ البتہ اس کے بعد حضرت علامہ اور مولانا کی چند ملاقاتوں کا تذکرہ سید نذیر نیازی اور خود مولانا کی بعض تحریروں میں ملتا ہے۔ مثلاً ۶/اپریل ۱۹۳۳ء کی سہ پہر کو حضرت علامہ طلبہ سے خطاب کرنے کے لیے جامعہ ملیہ میں تشریف لائے۔ ان دنوں مولانا جیراج پوری جامعہ میں پروفیسر تھے، اس موقع پر انھوں نے ایک مختصر تقریر کرتے ہوئے حضرت علامہ کا استقبال کیا۔ اس جلسے کا حال سید نذیر نیازی نے اپنے مکتوبات بنام علامہ اقبال میں اور فارابی القمری نے اپنے ایک مضمون (مشمولہ اقبال نامہ مرتبہ: چراغ حسن حسرت) میں بیان کیا ہے۔ سید نذیر نیازی لکھتے ہیں:

> اگلے روز سہ پہر میں حضرت علامہ پھر جامعہ تشریف لائے۔ مولانا اسلم نے خیر مقدم کیا۔ ان کی تقریر بڑی پر لطف اور خلوص وارادت سے بھری ہوئی تھی۔ مولانا نے کہا آپ ہمارے مدت العمر کے محبوب ہیں۔ آپ نے شعر کہنا کیا شروع کیا ہمارے دل میں گھر کرلیا۔ ہم اپنی محبت کا اظہار آپ کے استاد ہی کی زبان میں کریں گے۔ انھوں نے کہا تھا:
>
> تخلص داغ ہے اور عاشقوں کے دل میں رہتے ہیں!
>
> آپ کا گھر بھی عشاق کا دل ہے۔ آپ ہم سب کے محبوب ہیں۔ حضرت علامہ نے طلبہ سے خطاب کیا۔ انجمن اتحاد طلبائے جامعہ کی رکنیت قبول کی اور سپاس نامے کے جواب میں بڑے حوصلہ افزا کلمات ارشاد فرمائے۔ اس کے بعد طلبہ سے بات چیت کے ساتھ ان کی بیاضوں پر دستخط کرتے رہے۔ شام کو مجیب صاحب[۳] کے یہاں دعوت تھی۔ کھانے پر مزے مزے کی باتیں ہوتی رہیں۔ مولانا اسلم مرحوم سے بھی تبادلۂ خیالات ہوا۔ دعوت پر زیادہ تر بحث اسلامی ریاست ہی کی رہی۔[۴]

حضرت علامہ سے مولانا جیراج پوری اور ان کے احباب یعنی پرویز صاحب[۵] حضرت اسد ملتانی[۶] اور شیخ سراج الحق[۷] کی ایک تفصیلی ملاقات ۱۰/جنوری ۱۹۳۸ء کو لاہور میں علامہ کے دولت کدے پر ہوئی۔ اس ملاقات کی مفصل رُوداد سید نذیر نیازی کی قابلِ قدر کتاب اقبال کے حضور میں دیکھی جاسکتی ہے۔

اقبالیات کے حوالے سے مبصرانہ اور محاکمانہ سطح پر مولانا جیراج پوری کی حکمت و بصیرت کا اولین اظہار اسرارِ خودی پر ان کے تبصرے سے ہوتا ہے۔ اسرارِ خودی ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی تھی اور اس میں حضرت علامہ نے عجمی تصوف پر تنقید کی تھی۔ اس ضمن میں ان کے قلم سے حافظ شیرازی کے بارے میں بھی بعض سخت اشعار نکل گئے، مثلاً:

ہوشیار از حافظِ صہبا گسار
جامش از زہرِ اجل سرمایہ دار

عجمی تصوف کی مخالفت اور حافظ شیرازی کے خلاف اشعار کی وجہ سے برعظیم میں حضرت علامہ کے خلاف مخالفت کا سیلاب اُمڈ آیا۔ متعدد تصوف پرستوں نے نظم ونثر میں علامہ کے اس اُسلوب فکر پر لَے دے شروع کر دی۔ حضرت علامہ نے بھی جواباً کئی مضامین لکھے جواب مقالاتِ اقبال اور انوارِ اقبال وغیرہ میں شامل ہیں۔ اس بحث کی حمایت اور مخالفت میں اور کئی حضرات بھی کود پڑے۔ بڑے گھمسان کا رن پڑا۔ حضرت علامہ کے موقف کی حمایت میں مولانا ظفر علی خاں اور اس کی مخالفت میں خواجہ حسن نظامی پیش پیش تھے۔ حضرت اکبرالہ آبادی نے اقبال کے نقطۂ نظر کی حمایت کی۔ کئی شعرا مثلاً مظفر احمد صاحب فضلی اور حکیم فیروز الدین صاحب طغرائی نے اسرار خودی کے جواب میں مثنویاں لکھیں۔

مولانا جیراج پوری اس سارے ہنگامے کو دیکھ رہے تھے اور خاموش تھے۔ معلوم نہیں کیوں وہ اس بحث کو اُصولی بحث نہیں سمجھتے تھے۔ بہرحال بعض دوستوں کے اصرار پر انھوں نے اسرارِ خودی اور اس کی متعلقہ بحثوں پر قلم اُٹھایا اور ان کا مضمون ماہنامہ الناظر کے فروری ۱۹۱۹ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ مولانا جیراج پوری عدل گستر اور بے لاگ ناقد تھے، علمی و ادبی کتابوں کے تبصروں میں بھی ان کا یہی اُسلوبِ نقد قائم رہتا تھا اور اپنی انتقادی کاوشوں میں وہ دانے سے بھوسے کو الگ کرتے جاتے تھے۔ چنانچہ اسرارِ خودی کے تبصرے میں بھی جہاں انھوں نے عجمی تصوف کے مسئلے پر حضرتِ علامہ کی ہم نوائی کی اور فضلی اور طغرائی صاحبان کے اعتراضات کا جواب دیا، وہیں یہ بھی لکھا کہ:

> ڈاکٹر صاحب نے اس مثنوی میں خواجہ حافظ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اگر وہ نہ لکھتے تو بہتر تھا۔ کیونکہ اس کی وجہ سے ایک تو خود ان کی ذات پر حملے ہونے لگے،.....دوسرے نفسِ مسئلہ جو مفید تھا، ان ناگوار بحثوں کے حجاب میں آ گیا۔[۸]

مولانا جیراج پوری نے اس بات کو بھی حیرت انگیز گردانا ہے کہ حضرت علامہ اقبال نے خواجہ حافظ کے مقابلے میں عرفی شیرازی کی تحسین فرمائی تھی حالانکہ عرفی تو خود شمعِ حافظ کا پروانہ ہے۔ تاہم علامہ اقبال مولانا جیراج پوری کے تبصرے کی اشاعت سے پہلے ہی ان نتائج تک پہنچ چکے تھے جن کی نشان دہی مولانا نے فرمائی تھی۔ بلکہ مولانا کے تبصرے کی اشاعت سے پہلے ہی اسرارِ خودی کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۱۸ء کے نصفِ آخر کے اوائل میں شائع ہو گیا تھا اور اس میں تمام قابلِ اعتراض اشعار حذف کر دیے گئے تھے اور متعدد دیگر تبدیلیاں بھی کر دی گئی تھیں۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی کتاب تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ میں ان ترامیم کی تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔ بہرحال حضرت علامہ نے مولانا کے تبصرے کو قدر اور احترام کی نظر سے دیکھا اور ۷ مئی ۱۹۱۹ء کو انھیں شکریے کا خط لکھا۔ مولانا جیراج پوری کا قیاس ہے کہ حضرتِ علامہ نے اسرارِ خودی پر انھی کے تبصرے کو مدِنظر رکھتے ہوئے اپنا یہ مشہور شعر کہا تھا:

گئے دن کہ تنہا تھا مَیں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں[۹]

پیام مشرق کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا اور دوسرا مارچ ۱۹۲۴ء میں۔ مولانا جیراج پوری کا تبصرہ اس کتاب پر دوسرے ایڈیشن کی اشاعت سے غالباً پہلے شائع ہوا تھا کیونکہ دوسرے ایڈیشن میں اس غلطی کی اصلاح کر دی گئی ہے جس کی نشان دہی پہلے ایڈیشن کے چھپنے پر کی گئی تھی۔ اس تبصرے میں مولانا نے پیامِ مشرق کے مندرجات کی کشادہ دلی سے تحسین کی ہے۔ وسیع المطالعہ اور حاضر دماغ ہونے کی وجہ سے وہ جابہ جا اقبال کے اشعار کے ہم مضمون اشعار متقدمین کے کلام سے نقل کرتے جاتے ہیں اور اس طرح مطالعۂ کلامِ اقبال میں مزید دل کشی کا سامان پیدا کر دیتے ہیں لیکن جہاں ضروری سمجھتے ہیں، گرفت بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے آغازِ تبصرہ میں اس کتاب کے تہدیہ بنام امان اللہ خان حاکمِ افغانستان کو تو سراہا ہے لیکن اسرارِ خودی کے انتساب کے بارے میں، جسے حضرت علامہ نے دوسرے ایڈیشن میں حذف کر دیا تھا، بعد از وقت، یہ لکھا ہے:

اس سے پیشتر ڈاکٹر صاحب کی ایک مثنوی کا تہدیہ میری نظر سے گزرا تھا جس کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی کہ اللہ اکبر!

اسرارِخودی کی تعلیم اور اس پر یہ بے خودی:

چو روئے خویش در آئینہ می توانی دید
چرا نظر بہ جمالِ کسے دگر داری[۱۰]

اس انتساب یا تہدیہ کی بحث میں مولانا نے کیا خوب نکتہ بیان کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

کتاب کو کسی کے نام سے معنون کر دینا ایک عام رسم ہوگئی ہے۔ حالانکہ اس کا موقع صرف وہ ہے جب کہ کتاب کے مقصد کو اس سے مدد مل سکے۔ ورنہ اہل نظر اس کو کتاب کی خواری اور مصنف کی سبکساری کی دلیل سمجھتے ہیں۔[۱۱]

مولانا نے پیام مشرق (اشاعت اوّل) کی ایک نظم بعنوان ''بوئے گل'' کے درج ذیل شعر پر بھی اعتراض کیا تھا:

زندانیِ کہ بند ز پایش کشادہ اند
آہے گزاشت است کہ بُو نام دادہ اند

مولانا کا اعتراض یہ تھا کہ ''آہے گزاشت است'' کا ٹکڑا ذوقِ سلیم کو کھٹکتا ہے۔'' اس اعتراض کے پیشِ نظر حضرت علامہ نے اس شعر کو یوں بدل دیا:

زاں نازنیں کہ بند ز پالیش کشادہ اند
آہے ست یاد گار کہ بُو نام دادہ اند

اس کے باوجود حضرت علامہ نے اس مسئلے پر سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریا بادی اور گرامی جالندھری سے مشورہ کرنا ضروری سمجھا۔ حضرت گرامی نے کچھ مشورہ دیا لیکن حضرت علامہ کو موقع و محل کے لحاظ سے اپنا ہی متبادل شعر زیادہ مناسب معلوم ہوا۔ چنانچہ پیام مشرق کے دوسرے ایڈیشن میں اسی کے مطابق تبدیلی کر دی گئی۔[۱۲]

پیام مشرق ہی کے تبصرے میں مولانا نے جمہوریت کے بارے میں حضرت علامہ کے نقطۂ نظر سے بھی اختلاف کیا ہے۔ حضرت علامہ نے لکھا ہے:

گریز از طرز جمہوری، غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

مولانا کا کہنا تھا کہ:

حضرت علامہ کا یہ قول نہایت تعجب انگیز ہے۔ اس لیے کہ اگر وہ ''پختہ کار'' صاحب بھی ''خرِ نامشخص'' نکلے تو پھر کیا ہوگا؟ .....اس میں کچھ شک نہیں کہ رائے صواب ہر معاملے میں صرف ایک ہی ہوتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وہ ایک شخص سے حاصل کی جائے یا ایک جماعت سے۔ مشورے میں دو فائدے ہیں: ۱- نتیجہ خراب ہونے کی صورت میں ملامت کا خوف نہیں رہتا۔ اسی بنیاد پر رسولِ اکرم کو بھی جن کی رائے کے قطعی درست ہونے میں شبہ نہیں تھا شاورھم فی الامر کا حکم دیا گیا۔ ۲- بہ نسبت ایک شخص کے جماعت میں اغلباً مذاقِ صحیح موجود ہوتا ہے۔ اس لیے عام مسلمانوں کے لیے امرھم شوریٰ بینھم نازل ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کی رائے کی کوئی توجیہ میری سمجھ میں بجز اس کے نہیں آتی کہ میں اس کو ان کی تعلیمات سے نکال کر مطائبات میں شمار کرلوں۔[۱۳]

افسوس ہے کہ مولانا نے جمہوریت اور نظام خلافت کے امتیازات پر کوئی روشنی نہیں ڈالی۔

جاوید نامہ پر جناب اسلم جیراج پوری کا تبصرہ ۱۹۳۲ء ہی میں لکھا گیا۔ اس تبصرے میں مولانا نے مختلف افلاک کی سیر کا خلاصہ درج کیا ہے اور تعلیمات اقبال کا اجمالی ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام اور اشتراکیت کا فرق بھی واضح کیا ہے۔ انھوں نے اپنے تجزیے میں بتایا ہے کہ رُوس لا کی منزل پر آ کر رک گیا ہے اور الّا کی طرف نہیں بڑھا۔ جناب جیراج پوری تعلیماتِ اقبال کو کلام الٰہی کی روشنی میں دکھانے کے بھی متمنی تھے لیکن تبصرے کی تنگ دامانی کی وجہ سے یہ ارادہ ترک کرنا پڑا۔ انھوں نے جاوید نامہ کو فارسی ادبیات کی پانچ اعلیٰ ترین کتابوں میں شامل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

ہم سنا کرتے تھے کہ فارسی زبان سیکھنے کے بعد صرف چار کتابیں اچھی پڑھنے کو ملتی ہیں، شاہ نامۂ فردوسی، مثنوی مولانا رُوم، گلستان سعدی، اور دیوانِ حافظ مگر اب جاوید نامہ کو بھی پانچویں کتاب سمجھنا چاہیے جو کہ معنویت اور نافعیت کے لحاظ سے ان سب پر فوقیت رکھتی ہے۔[۱۴]

جاوید نامہ میں بھی ایک نکتے پر وہ حضرت علامہ سے اختلاف کرتے ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں:

''فلکِ مشتری پر ڈاکٹر صاحب کی ایک ادا قرآن کے خلاف معلوم ہوئی اس لیے اس کو بھی ظاہر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ وہ جوہر مصطفیٰ کی حقیقت جس کو اللہ تعالیٰ معراج کے بیان میں ''عبدہٗ'' فرماتا ہے، حلاج کی زبان میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

کس ز سرِ عبدہٗ آگاہ نیست
عبدہٗ جز سرِّ اِلّا اللّٰہ نیست
لا اِلٰہ تیغ و دم اُو عَبْدُہٗ
فاش تر خواہی بگو ھُوَ عَبْدُہٗ''

عبدہ کے بارے میں حضرت علامہ کے پانچ شعر نقل کرنے کے بعد مولانا لکھتے ہیں:

یہ حقیقت میں غلو ہے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو انسانیت کے حدود میں رکھنے سے ان کا اسوۂ حسنہ انسانوں کے لیے دلکش اور آسان رہتا ہے۔ بخلاف اس کے دائرۂ الوہیت میں داخل کر دینے سے ان کی پیروی نہ صرف دشوار بلکہ غیر ضروری بھی ہو جاتی ہے۔ غالباً اسی نکتے کی وجہ سے قرآن نے جہاں جہاں اس امر کو بیان کیا ہے، حصر کے ساتھ بیان کیا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے:

ھَلْ کُنْتُ اِلّا بَشَرًا رَّسُوْلاً (۱۷:۹۳)

ترجمہ: میں نہیں ہوں مگر ایک انسان پیغام لانے والا۔

سورۂ کہف میں ہے:

قُلْ اِنَّما اَنَا بَشَرٌ مِثْلُکُمْ یُوْحیٰ اِلَیَّ (۱۸:۱۱۰)

ترجمہ: کہہ دے کہ میں تو بس تمھارے ہی جیسا انسان ہوں، (مگر) مجھ پر وحی بھیجی جاتی ہے۔

یعنی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات، بجز اس کے کہ عالم غیب سے اللہ ان پر وحی بھیجتا ہے، بشریت ہی کے دائرہ میں محصور ہے اور کوئی شعبہ الوہیت کا اس میں نہیں ہے۔ مزید تصریحات قرآن کے متعدد آیات میں ہیں۔[۱۵]

''عبدہٗ'' کی اس وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اسلم جیراج پوری اپنے افکار و تصورات میں صراحت و صفا کے کتنے دل دادہ تھے اور ان کا تصورِ توحید کتنا محکم، بے آمیز اور غیر مبہم تھا۔

بال جبریل پر مولانا جیراج پوری اگرچہ تبصرہ نہ لکھ سکے لیکن اس کے مطالعے کے فوری تاثرات سید

نذیر نیازی کی وساطت سے ہم تک پہنچے ہیں۔ حضرت علامہ نے سیّد نذیر نیازی کے نام اپنے مکتوب مرقومہ ۱۲ جنوری ۱۹۳۵ء میں لکھا تھا کہ ''بال جبریل دو چار روز تک آپ کی خدمت میں ارسال ہوگی۔'' اس مکتوب پر حواشی لکھتے ہوئے سید نذیر نیازی رقم طراز ہیں:

بالِ جبریل دوسرے تیسرے روز پہنچ گئی۔ میں نہیں کہہ سکتا مولانا اسلم نے پیکٹ دیکھا تو کس اشتیاق سے کہا، ''اس پر پہلا حق میرا ہے۔'' میں نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ مولانا دوسرے روز کتاب واپس لائے تو فرمایا ''ڈاکٹر صاحب کی شاعری معراج کمال کو پہنچ گئی ہے اور پھر اس کے ساتھ اپنا وہ قطعہ بھی سُنایا جس کا آخری مصرع یوں تھا:

اوراق میں بکھرے ہوئے جبریل کے پر دیکھ!

جو آگے چل کر (ماہنامہ) طلوع اسلام میں شائع ہوا۔[۱۶]

ضرب کلیم (اشاعت اوّل ۱۹۳۵ء) کے بارے میں مولانا اسلم جیراج پوری کا ایک قطعہ ستمبر ۱۹۳۶ء کے طلوع اسلام میں شائع ہوا۔ یہ قطعہ مع تمہیدی نوٹ درج ذیل ہے:

ضربِ کلیم موصول ہوئی۔ مجھے کس قدر خوشی ہوئی اور.....اس کو بیان نہیں کرسکتا۔ ڈاکٹر صاحب کا کلام میرے لیے غذائے رُوح ہے اور میں ان کو ان سب شعرا سے افضل تر سمجھتا ہوں جو آج تک دنیائے اسلام میں ہوئے ہیں۔

آپ نے ریویو کی فرمایش کی ہے مگر میں نے آنکھوں کی تکلیف اور نگاہ کی کمزوری کے باعث مضمون نویسی بالکل چھوڑ دی ہے۔..... یہ دو شعر البتہ پیش کرتا ہوں۔ مناسب معلوم ہو تو ان کو طلوع اسلام میں شائع کر دیں تاکہ ڈاکٹر صاحب کی نظر سے گزر جائیں اور ساری ''اقبالی'' برادری کی نظر سے بھی۔

ضرب کلیم ہم نے تو دیکھی نہیں مگر
سُنتے ہیں اس کے ڈر سے دلِ کوہ خون تھا
اقبال کا قلم بھی عصائے کلیم ہے
اعجاز جس کا تَلْقَفُ مَا یَاْفِکُوْنَ تھا[۱۷]

پھر ۱۹۳۷ء میں ضرب کلیم پر جناب جیراج پوری کا تبصرہ بھی شائع ہوا۔ یہ تبصرہ نوادرات میں بھی شامل ہے۔ اس مختصر مضمون کی تمہید میں بھی مولانا نے حضرت علامہ کو زبردست خراج پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

یہ [مجموعہ ضرب کلیم] کس قدر دل کش اور رُوح پرور ہے، صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ان اشعار کی تعریف کرنا یا دوسرے شعرا کے کلام کی طرح ان کی داد دینا، یا اپنے خیال کے ساتھ ان کی مطابقت دکھانا، یا بے کیف توضیحات کر کے ان کی لطافت کو کھونا نہ صرف کورذوقی ہے بلکہ شریعتِ ادب میں گناہِ کبیرہ ہے کیونکہ یہ شاعری نہیں ہے بلکہ حیات ملیۂ اسلامیہ کے ان اہم مسائل کے متعلق جن میں مفکرین غلطاں و پیچاں ہیں

اور جو دفتر کے دفتر سیاہ کرنے سے بھی حل نہیں ہوتے، دو دو اور چار چار شعروں میں بچی اور تلی رائیں، روشن تعلیمات اور بے پردہ حقائق ہیں جو اہلِ بصیرت کی نگاہوں میں موتی کی طرح چمک رہی ہیں۔[18]

پھر اچانک مولانا رخ بدل کر فرماتے ہیں:

لیکن میرا طریقۂ فکر جداگانہ ہے۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب کی بعض باتوں سے کلی طور پر میں متفق نہیں ہو سکا۔ انھیں کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ''مہدی'' کے عنوان سے وہ فرماتے ہیں:

مجذوبِ فرنگی نے بہ اندازِ فرنگی
مہدی کے تخیل سے کیا زندہ وطن کو
اے وہ کہ تو مہدی کے تخیل سے ہے بیزار
نومید نہ کر آہوئے مشکیں سے ختن کو

اس میں غالباً روئے سخن میری طرف ہے کیونکہ مہدی کے عقیدے کے اسلامی ہونے سے سب سے پہلے میں نے علی الاعلان انکار کیا ہے۔[19]

معلوم نہیں مولانا نے اس متذکرہ عقیدۂ مہدی کے اسلامی ہونے سے پہلی بار کب انکار کیا تھا لیکن حضرت علامہ تو غالباً ہمیشہ سے مہدی کے معروف تصور کے خلاف رہے۔ چنانچہ انھوں نے تو ۱۹۰۵ء میں کہا تھا:

مینارِ دل پہ اپنے خدا کا نزول دیکھ
یہ انتظارِ مہدی و عیسیٰ بھی چھوڑ دے[20]

تاہم بانگِ درا کی تدوین کے وقت اس شعر کو بوجوہ متعلقہ غزل سے حذف کر دیا گیا۔ اپنے اسی نقطۂ نظر کا اعادہ حضرت علامہ نے اپنی انگریزی نوٹ بک *Stray Reflections* (۱۹۱۰ء) میں کیا ہے:

Give up waiting for the Mehdi - the personification of power. Go and create him. [21]

بالِ جبریل اور ضربِ کلیم کے بعض دیگر اشعار میں بھی حضرتِ علامہ نے ظہورِ مہدی کے بارے میں اپنے اس خیال کی تکرار کی ہے۔ مثلاً بالِ جبریل (ص ۹۰) میں مہدی کے بارے میں ان کا یہ مشہور شعر ہے:

ہوئی جس کی خودی پہلے نمودار
وہی مہدی وہی آخر زمانی

مہدی کے بارے میں حضرت علامہ کا یہ نقطۂ نظر ان کی نثری نگارشات میں بھی کئی جگہ مل جائے گا۔ مثلاً ضربِ کلیم کی اشاعت اول سے تین سال پہلے ۷/اپریل ۱۹۳۲ء کو حضرت علامہ نے چودھری محمد احسن کو لکھا:

میرے نزدیک مہدی، مسیحیت اور مجددیت کے متعلق جو احادیث ہیں وہ ایرانی اور عجمی تخیلات کا نتیجہ ہیں۔

عربی تخیلات اور قرآن کی صحیح سپرٹ سے ان کو کوئی سروکار نہیں۔[۲۲]

پھر یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ظہورِ مہدی کے تصور کے غیر اسلامی ہونے کے بارے میں اولین اظہار کرنے والے نہ علامہ اقبال ہیں نہ مولانا جیراج پوری۔ یہ تصور صدیوں پہلے سے عالم اسلام کے اکابر کے اعتراضات کی زد پر رہا ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے جناب سعید شیخ (مرتب خطبات اقبال۔انگریزی) کے حوالے سے لکھا ہے:

> ابن خلدون نے بھی مہدویت وغیرہ کے تصور پر کڑی تنقید کی تھی۔ اس ضمن میں ابن خلدون نے مہدی کے ذکر پر مبنی چوبیس احادیث کا ذکر کیا ہے۔ ان احادیث میں سے کوئی ایک بھی بخاری یا مسلم میں شامل نہیں۔ ابن خلدون نے ان تمام احادیث کے استناد کو چیلنج کیا ہے۔[۲۳]

مولانا جیراج پوری کے زیرِ بحث ارشاد کے بارے میں اہم ترین بات یہ ہے کہ انھوں نے حضرت علامہ کی نظم ''مہدی'' کو سمجھنے میں کچھ عجلت پسندی سے کام لیا ہے۔ اگر اقبال اس نظم میں عمومی تصورِ مہدی کی حمایت کر رہے ہوتے تو وہ اس نظم کے آخری شعر میں یہ کیوں فرماتے:

ہو زندہ کفن پوش تو میّت اسے سمجھیں
یا چاک کریں مردکِ ناداں کے کفن کو

حضرتِ علامہ کے کلام کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمانانِ عالم، انتظارِ مہدی میں خود بے عمل ہو کر مردوں کی طرح کفن پوش پڑے ہیں۔ حالانکہ انھیں خود مہدی بننا چاہیے۔ اب ان نادانوں کا علاج یہ ہے کہ ان کے کفن کو چاک کر کے انھیں زندہ ہونے کا احساس دلایا جائے۔

ضرب کلیم کے شارحین مثلاً مولانا غلام رسول مہر اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے بھی اس نظم کی تشریح میں یہی موقف اختیار کیا ہے یعنی اسے احیائے ملتِ بیضا کا ایک نسخہ قرار دیا ہے۔ چشتی صاحب اپنی شرح ضرب کلیم میں لکھتے ہیں:

> یہ نظم بہت غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔... آخر مہدی آسمان سے تو آئے گا نہیں۔ اللہ ملتِ اسلامیہ ہی میں سے کسی فرد کو اس منصب رفیع پر سرفراز فرمائے گا۔ تو کیوں نہ ہر مسلمان اس عزت کے حصول کے لیے کوشش کرے..... پس مسلمان کا مہدی کے انتظار میں، عمل صالح اور جدوجہد سے بیگانہ ہو جانا ایسا ہی افسوس ناک ہے جیسا کہ کوئی زندہ آدمی کفن پہن کر مردہ بن کر لیٹ جائے۔[۲۴]

ان گزارشات سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ نظم ''مہدی'' میں حضرت علامہ نے تصورِ ظہورِ مہدی کے مروج عقیدے کی تائید نہیں کی۔ یہ البتہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نظم میں انھوں نے مہدی کے تصور کی حیات آفریں تاویل فرمائی ہے۔

مولانا اسلم جیراج پوری نے حضرت علامہ کے انگریزی خطبات کے اُردو ترجمے یعنی تشکیلِ جدید الٰہیات اسلامیہ کے سلسلے میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ حضرت علامہ کے یہ انگریزی خطبات پہلی بار ۱۹۳۰ء میں: *Six Lectures on Reconstruction of Religious Thought in Islam.* کے نام سے شائع ہوئے تھے۔ اس ایڈیشن کے آغازِ اشاعت ہی میں حضرت علامہ کو اس کے ترجمے کا خیال پیدا ہوگیا تھا۔ حضرت علامہ چاہتے تھے کہ ڈاکٹر سید عابد حسین[۲۵] ان خطبات کا ترجمہ کریں لیکن ڈاکٹر عابد حسین اپنی گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے یہ اہم ذمہ داری اُٹھانے سے قاصر رہے۔ آخر بہت غور وفکر اور باہمی مشاورت کے بعد حضرت علامہ نے سیّد نذیر نیازی کو اس کتاب کے ترجمے کی اجازت دی اور نیازی صاحب نے ۱۹۳۰ء ہی میں ان خطبات کا ترجمہ شروع کردیا۔ ۱۹۳۴ء میں حضرتِ علامہ کی یہ انگریزی تصنیف بعض لفظی ترامیم اور ایک خطبے کے اضافے کے بعد اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس لندن سے دوبارہ شائع ہوئی۔ اس ایڈیشن میں کتاب کے نام سے ''سکس لیکچرز آن'' کے الفاظ حذف کردیے گئے تھے۔ خطبات کا دوسرا ایڈیشن سامنے آ گیا تو سید نذیر نیازی نے اسی کے مطابق خطبات کا ترجمہ مکمل کیا۔ حضرت علامہ چاہتے تھے کہ کتاب کا ترجمہ عام فہم ہو اور ترجمہ کے بعض اجزا چند علما کی نظر سے بھی گزر جائیں۔ چنانچہ نیازی صاحب نے اس سلسلے میں مولانا محمد السورتی[۲۶] سید سلیمان ندوی[۲۷] اور مولانا محمد اسلم جیراج پوری سے مسلسل رابطہ رکھا۔ ان مشاورتی محفلوں میں ڈاکٹر سید عابد حسین بھی شریک ہوتے تھے۔ مولانا جیراج پوری کا ذکر کرتے ہوئے سید نذیر نیازی لکھتے ہیں: ''مولانا اسلم نے بھی بالالتزام ہر خطبے کا ترجمہ سنا۔ انھیں حضرتِ علامہ سے جو عقیدت تھی، محتاج بیان نہیں۔''[۲۸] جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، مولانا جیراج پوری اختلاف رائے میں بہت بے باک تھے۔ کچھ ایسی ہی صورتِ حال خطبات کے ترجمے کے ضمن میں بھی پیش آئی۔ تیسرے خطبے میں آیۂ نور کی بحث میں شاید نیازی صاحب کے ترجمہ کی نارسائی کی وجہ سے مولانا جیراج پوری کو اعتراض پیدا ہوا کہ حضرت علامہ نور کو مادّی نور کے معنوں میں استعمال کر رہے ہیں۔ اور انھوں نے اصرار کیا کہ ان کا یہ خیال حضرت علامہ تک پہنچایا جائے۔ چنانچہ نیازی صاحب کے خط کے جواب میں حضرت علامہ نے ۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو لکھا:

> مولانا اسلم کا ارشاد بجا ہے۔ مگر اس آیت کو تاریخی نقطۂ نگاہ سے دیکھنا چاہیے کہ اس مضمون کی آیات قریباً تمام کتب سماوی میں موجود ہیں۔ اس کا مقصود یہ نہیں کہ خدا مادّی معنوں میں نور ہے۔ (یعنی)
>
> Light dealt within physical science[29] نور محض ایک استعارہ ہے۔ جیسے قدیم کتب سماوی میں pantheistic اغراض کے لیے استعمال کیا گیا تھا، یعنی وجودِ باری کو ہمہ گیر Pervasive ظاہر کرنے کے لیے۔ قرآن نے میری رائے ناقص میں اس قدیم استعارے کو وجود باری کی Absoluteness پر اشارہ

کرنے کے لیے استعمال کیا ہے، کیونکہ عالم مادّی میں بھی زمانۂ حال کی تحقیق کی رُو سے صرف نور ہی ایک ایسی چیز ہے جو Relatively Absolute ہے۔[۳۰] مقدمہ وغیرہ کا انتظام ابھی سے کر لیجیے.....

مکرر آنکہ معلوم ہوتا ہے تیسرے خطبے میں جو کچھ آیت مذکورہ میں میں نے لکھا ہے، آپ کو اس کی اچھی طرح سمجھ نہیں آ سکی۔ ورنہ مولانا اسلم اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتے کہ میرے خیال میں اس آیتِ قرآنی میں خدا تعالیٰ نے اپنے آپ کو نور (مادّی معنوں میں) قرار دیا ہے۔[۳۱]

حضرت علامہ کے اس مکتوب کے مندرجات پر اظہار رائے کرتے ہوئے سیّد نذیر نیازی لکھتے ہیں:

[حضرت علامہ کو] تنبیہہ کا خیال بشکلِ ''مکرر آنکہ'' بعد میں آیا۔ بہرحال میں نے مولانا کو حضرت علامہ کا مکتوب پڑھ کر سنا دیا۔ لیکن ان کی تسلی نہ ہوئی۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ کا اپنے آپ کو نور السمٰوٰت کہنا اس لیے نہیں کہ یہاں نور سے مراد وہ نور نہیں جو مرئی کے ساتھ قائم ہے اور جسے قرآن پاک میں نصاً مخلوق کہا گیا ہے بلکہ یہ وہ نور ہے جو رائی کے ساتھ قائم ہے یعنی جس سے اس عالم کی ہستی محسوس ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ آیت زیادہ غور و فکر کی محتاج ہے۔ مزید تشخصات دراصل اس (نور) کو سمجھانے کے لیے ہیں۔ ان پر غور کرنا لازم ہے مثلاً بیت سے مراد ہے دین، طاق سے مردِ مومن، زجاج سے ایمان، زجاجہ سے قلب، زیت سے آسمانی تعلیم۔[۳۲] میں نے مولانا کی تاویل حرف بہ حرف حضرت علامہ کی خدمت میں پہنچا دی۔ (حضرت علامہ کے مندرجہ بالا مکتوب میں) مقدمے کا اشارہ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے مقدمے کی طرف ہے۔ حضرتِ علامہ کے ذہن میں یہ خیال مولانا اسلم کی تاویل کو دیکھ کر پیدا ہوا۔[۳۳]

۱۱ دسمبر ۱۹۳۰ء کو حضرتِ علامہ نے نیازی صاحب کو آیۂ نور کے سلسلے میں مزید لکھا:

آیۂ نور کے متعلق میں نے جو کچھ لکھا ہے اُسے تاویل کہنا صحیح نہیں ہے۔ تاویل کا لفظ اس وقت صحیح ہوتا ہے جب کسی آیت کے الفاظ کے عام معنی چھوڑ کر کوئی اور معانی لیے جائیں۔ میں نے لفظ نور کے وہی معنی لیے ہیں جن میں یہ لفظ عام طور پر لیا جاتا ہے۔ اگر آپ کہیں کہ اس آیہ میں نور، علی ھذا القیاس زجاج وغیرہ سے کچھ اور مراد ہے تو یہ تاویل ہوگی۔ میں نے اپنے تمام لیکچروں میں اس قسم کی تاویل سے پرہیز کی ہے اور الفاظ کو انھیں [انھی؟] معنوں میں لیا ہے جن میں وہ عام طور پر مستعمل ہوتے ہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ حضور رسالت مآبؐ کا یہی طریق تھا۔ یہی طریقِ بحث ابنِ حزم کا ہے۔ مولانا رُوم کا یہ شعر میرے لیے نہ صرف دلیلِ راہ ہے بلکہ سوز و گداز کا بھی سامان ہے:

کردہ ای تاویل حرفِ بکر را
خویش را تاویل کن، نے ذکر را[۳۴]

حضرتِ علامہ کے اس مکتوب پر تبصرہ کرتے ہوئے سید نذیر نیازی لکھتے ہیں:

قرآن پاک سے حضرت علامہ کے عشق کی یہ کیفیت تھی کہ ادھر مولانا (جیراج پوری) کی تاویل حضرت علامہ

کی خدمت میں پہنچی اور ادھر انھوں نے دوسرے ہی روز اس کا مفصل جواب رقم فرما دیا۔ جس سے (جہاں تک میں سمجھ سکا) مولانا کا پورا پورا اطمینان ہو گیا۔ اس لیے کہ انھوں نے پھر کبھی یہ بحث نہیں چھیڑی۔[۳۵]

حضرت علامہ نے اپنے متذکرہ بالا مکتوب نگاشتہ ۹ر دسمبر ۱۹۳۰ء میں فرمایا کہ آیۂ نور میں نور کا لفظ استعارتہً استعمال ہوا ہے۔ یہی موقف انھوں نے اپنے تیسرے خطبے (انگریزی) میں بھی اختیار کیا ہے اور لکھا ہے کہ نور کا استعارہ اللہ کی مطلقیت (Absoluteness) کو بیان کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔[۳۶] لیکن حضرت علامہ کی یہ رائے صرف لفظ ''نور'' کے بارے میں ہے۔ دیگر متعلقہ الفاظ مثلاً مشکوٰۃ، مصباح وغیرہ کے بارے میں نہیں۔ اگر ہم آیۂ نور کے الفاظ مَثَلُ نورِہٖ کَمِشکوٰۃٍ فِیھَا مِصبَاح پر ذرا غور کریں تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں مشکوٰۃ، مصباح اور ان سے متعلقہ دیگر الفاظ استعارے کے طور پر نہیں بلکہ تمثیلی یا تشبیہی معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ جہاں تک لفظ ''نور'' کا مفہوم متعین کرنے کا معاملہ ہے، حضرت علامہ اور مولانا جیراج پوری کے مواقف میں کوئی بنیادی فرق نظر نہیں آتا لیکن اگر اس تمثیل کو پھیلانے کی کوشش کی جائے اور اس سے متعلق دیگر الفاظ یعنی مشکوٰۃ، مصباح، زیتون وغیرہ کے تمثیلی معانی کی جستجو شروع کی جائے تو معاملہ ذرا الجھ جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان الفاظ و علامات کی تحلیل و تشریح میں مفسرینِ قرآن نے بھی قیاس سے کام لیا ہے لیکن تمثیلی معانی کے تعین میں مفسرین کے یہاں بھی کامل مطابقت نہیں ملتی بلکہ خاصا اختلاف دکھائی دیتا ہے۔ مثال کے طور پر یہاں مولانا جیراج پوری اور مولانا مودودی کے متعینہ معانی کا فرق پیش کیا جاتا ہے۔ مولانا جیراج پوری کے نزدیک طاق (المشکوٰۃ) سے مراد ہے مردِ مومن، زجاج سے مراد ہے قلب، زیت سے مراد آسمانی تعلیم وغیرہ۔ جب کہ مولانا مودودی نے اپنی شہرہ آفاق تفسیر تفہیم القرآن میں طاق سے مراد کائنات، مصباح یا چراغ سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات اور زجاج سے مراد وہ پردہ لیا ہے جس میں حضرتِ حق نے اپنے آپ کو نگاہِ خلق سے چھپا رکھا ہے۔[۳۷] تاویلوں کے اس جاں شکن سرابستان میں سرگرداں اور آخر کار تشنہ میری کا شکار ہونے سے بہتر ہے کہ حضرتِ علامہ اقبال کے دین آموز اور حیات افروز موقف کو تسلیم کر لیا جائے۔

مولانا اسلم جیراج پوری، جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے، اسلامی فکریات کے ایک خوش آہنگ شاعر بھی تھے۔ چنانچہ ان کے اس کمالِ سخن کا اظہار اقبالیات کے حوالے سے بھی ہوا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی دو نظمیں ہمارے سامنے آئی ہیں۔ ایک تو انھوں نے حضرت علامہ کی ایک نظم ''میلادِ آدم'' جو دراصل پیام مشرق کی نظم بعنوان ''تسخیر فطرت'' کا پہلا حصہ ہے، کا منظوم ترجمہ کیا ہے اور دوسرے ''زندہ رود'' کے عنوان سے حضرت علامہ کو خراج عقیدت و ارادت پیش کیا ہے۔

حضرت علامہ کی پانچ اشعار کی مختصر نظم ''میلادِ آدم'' کا منظوم اُردو ترجمہ مولانا نے اسی عنوان کے تحت کیا ہے اور پھر ان اشعار پر چار اشعار کا اضافہ بھی کر دیا ہے۔ اس طرح نظم کا یہ حصہ معنوی طور پر بھی کچھ وسیع

تر ہو گیا ہے۔ یہ منظوم ترجمہ ماہنامہ طلوع اسلام کے دسمبر ۱۹۳۸ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ دو اشعار کا ترجمہ یہاں بطور مثال درج کیا جاتا ہے:

اصل

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شُد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

ترجمہ:

عشق چیخ اُٹھا کہ اک خونیں جگر پیدا ہوا
حسن کانپ اُٹھا کہ اک صاحب نظر پیدا ہوا

اصل:

زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر
تا ازیں گنبدِ دیرینہ درے پیدا شد

ترجمہ:

زندگی بولی کہ تھی میں آب و گل میں مضطرب
بارے آج اس گنبدِ بے در میں در پیدا ہوا[۳۸]

اس منظوم ترجمے کے بارے میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مولانا نے ترجمے میں حضرت علامہ کے اُسلوب شعر کے اختصاصی عناصر کو قائم رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

نظم ''زندہ رود'' ماہنامہ طلوع اسلام کے ستمبر ۱۹۴۰ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ اس زمانے میں اس رسالے کے مدیر اخوندزادہ حسین امام تھے۔ حضرت علامہ نے جاوید نامہ میں اپنے آپ کو ''زندہ رود'' کہا ہے۔ حضرت جیراج پوری نے اسی کے تتبع میں اپنی نظم کا عنوان ''زندہ رود'' قائم کیا۔ یہ نظم دی انٹر کالجیٹ مسلم برادر ہڈ کے زیر اہتمام ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو منعقد ہونے والے ''اقبال ڈے'' میں پڑھی گئی تھی۔ ادارے کی طرف سے نظم کے تمہیدی نوٹ میں لکھا گیا ہے کہ یہ نظم:

اس قدر مقبول ہوئی کہ آج تک اس کی اشاعت کے تقاضے موصول ہو رہے ہیں۔ ''زندہ رود'' آج ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے لیکن اس رُود کے زندہ ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے کہ اقبال اس پیکرِ خاکی کا نام نہیں جو زیرِ زمین مدفون ہے بلکہ اس آفتابِ حقیقت کا نام ہے جو ظلمت کدۂ عالم میں آج بھی اسی طرح ضو بار ہے، جیسے پہلے تھا کہ اس آفتاب نے اللہ کی کتابِ مبین سے اکتسابِ نور کیا تھا۔ اقبال کی حقیقت ایک اقبال شناس اور قرآن دان کی زبان سے سُنیے۔[۳۹]

نظم ''زندہ رُود'' مثنوی کی ہیئت میں ہے۔ گیارہ اشعار کی نظم کے آخری چار شعر یہاں بطور نمونہ درج کیے جاتے ہیں:

عشق را تازہ برات آوردہ ای
یعنی پیغامِ حیات آوردہ ای
شرح دادی عالم موجود را
وا نمودی منزلِ مقصود را
گفتۂ تو مغز و جانِ شاعری
بر تو می نازد جہانِ شاعری
اے کہ از آبِ حیاتی زندہ رُود
بر روانی ہاے تو از من درود[۴۰]

مولانا اسلم جیراج پوری نے حضرت علامہ کے فکر وفن پر اگرچہ زیادہ نہیں لکھا لیکن اقبالیات میں ان کا یہ مختصر کام بھی فن آشنائی اور فکر افروزی کے حوالے سے دفاتر پر بھاری ہے۔ ان کی دینی اور ادبی بصیرت مسلمہ تھی اور ان کی رائے صحت وصواب کی آئینہ دار ہوتی تھی۔ وہ کبھی اختلاف برائے اختلاف نہیں کرتے تھے بلکہ ان کا اختلاف بھی دین وادب کے اعلیٰ معیاروں کے تناظر میں ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت علامہ بھی ان کی رائے کا احترام کرتے تھے اور ان کی آرا سے حسبِ موقع شکریے کے ساتھ استفادہ کرنے میں بھی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ مولانا کا اختلاف اپنی علمی وادبی نمود ونمایش کے لیے بھی نہیں ہوتا تھا بلکہ یہ ہمیشہ اخلاص ومحبت کی بنیاد پر اور خوب تر کی تلاش کے لیے ہوتا تھا۔ یہ کیسی بے نفسی کی بات ہے کہ جب حضرت علامہ نے مولانا کے توجہ دلانے پر اپنے بعض اشعار میں تبدیلی کر لی تو مولانا نے وہ اعتراضات آیندہ اشاعتوں میں اپنے مضامین سے خارج کر دیے البتہ وہ اعتراضات باقی رہنے دیے جن سے حضرت علامہ متفق نہیں ہو سکے تھے۔ مختصر یہ کہ حضرت علامہ اقبال کے فکر وفن کے بارے میں حضرت مولانا محمد اسلم جیراج پوری کی یہ تحریریں ہمارے اقبالیاتی ادب کا نہایت گراں قدر سرمایہ ہیں۔

حوالے وحواشی

۱- ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۵۶ء، بحوالہ معاصرین اقبال از ڈاکٹر فیوض الرحمٰن، نیشنل بک سروس لاہور، ص ۱۳۴۔

۲- نقوش، لاہور، خطوط نمبر ۲۔

۳- شیخ محمد مجیب صاحب، بی اے (آکسن): چانسلر جامعہ ملیہ دہلی۔

۴- مکتوبات اقبال بنام سید نذیر نیازی، اقبال اکادمی پاکستان کراچی، ۱۹۵۷ء، ص ۱۰۰-۱۱۱۔

۵- غلام احمد پرویز، معروف عالم دین سید نذیر نیازی کے زمانۂ ادارت کے بہت عرصہ بعد طلوع اسلام کے مدیر بنے۔ تبویب القرآن، انسان نے کیا سوچا؟ اور متعدد دیگر کتابوں کے مصنف۔

۶- اسد ملتانی: ولادت ۱۹۰۲، ملتان- وفات ۱۷ نومبر ۱۹۵۹ء راولپنڈی۔ ڈپٹی سیکرٹری وزارت امور خارجہ، شاعری میں علامہ اقبال کے براہ راست شاگرد۔ راقم نے ان کی نگارشات پر مشتمل دو کتابیں یعنی اقبالیات اسد ملتانی اور مشارق (مجموعۂ حمد ونعت) مرتب کی ہیں۔

۷- شیخ سراج الحق: انڈیا ریلوے بورڈ کے ایک عہدے دار۔ کبھی کبھار طلوع اسلام میں مضمون بھی لکھتے تھے۔

۸- علامہ اسلم جیراج پوری، نوادرات، اشاعت ثانی۔

۹- اس سلسلے میں مولانا جیراج پوری کے اصل الفاظ کے لیے ملاحظہ ہو اُن کا مکتوب بنام عبدالعزیز کمال، مطبوعہ نقوش لاہور، خطوط نمبر ۲، ص ۵۹۵۔ مولانا کا یہ قیاس اس لیے درست معلوم نہیں ہوتا کہ اگر ایسا ہو، تو علامہ نے ۱۹۱۹ء میں جو (مذکورہ) شعر کہا، وہ پہلے اردو مجموعۂ کلام (بانگِ درا) میں شامل ہونا چاہیے تھا۔ ایسا نہیں، بلکہ مذکورہ شعر بال جبریل (۱۹۳۶ء) میں ملتا ہے۔ کسی واقعے کے ۲۶-۲۷ سال بعد جو شعر سامنے آیا، اُسے ماضیِ بعید پر منطبق کرنا، فقط خوش خیالی ہے۔ (ادارہ)

۱۰- محمد اسلم جیراج پوری، نوادرات، طبع دوم، ص ۹۱۔

۱۱- ایضاً

۱۲- محمد عبداللہ قریشی (مرتب)، مکاتیب اقبال بنام گرامی، اقبال اکادمی، پاکستان کراچی ۱۹۶۹ء، ص ۲۳۲-۲۳۳۔

۱۳- نوادرات، ص ۱۰۵۔

۱۴- ایضاً، ص ۱۱۵۔

۱۵- ایضاً، ص ۱۱۴-۱۱۵۔

۱۶- مکتوبات اقبال بنام سید نذیر نیازی، ص ۲۴۵۔

۱۷- ماہنامہ طلوع اسلام، لاہور (زیرادارت سید نذیر نیازی)، ستمبر ۱۹۳۶ء، ص ۵۔

۱۸- نوادرات، اشاعت دوم، ص ۱۱۷۔

۱۹- ایضاً، ص ۱۱۷۔

۲۰- علامہ محمد اقبال، کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال، ڈاکٹر صابر کلوروی (مرتب)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور ۲۰۰۴، ص ۳۰۶، نیز باقیاتِ شعرِ اقبال کے متعدد دیگر مجموعے۔

۲۱- *Stray Reflections*، ۱۹۶۱ء، ص ۹۴۔
۲۲- اقبال نامہ، جلد دوم (مرتب: شیخ عطاء اللہ)، شیخ محمد اشرف لاہور ۱۹۵۱ء، ص ۲۳۱۔
۲۳- ڈاکٹر تحسین فراقی، اقبال چند نئے مباحث، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۹۲۔
۲۴- پروفیسر یوسف سلیم چشتی، شرح ضرب کلیم، عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور، ص ۱۷۴-۱۷۷۔
۲۵- ڈاکٹر سید عابد حسین (۱۸۹۶-۱۹۷۹ء) بھوپال میں پیدا ہوئے۔ جرمنی سے فلسفے میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ علی گڑھ اور دہلی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں فلسفے کے استاد رہے۔ گوئٹے کے مشہور ڈرامے فاؤسٹ کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ان کی کتاب مضامین عابد بھی شائع ہو چکی ہے۔
۲۶- محمد السورتی (م: اگست ۱۹۴۲ء) جامعہ ملیہ اسلامیہ میں عربی کے پروفیسر رہے۔
۲۷- سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴-۱۹۵۳) علامہ شبلی نعمانی کے شاگردِ خاص۔ آپ نے علامہ شبلی نعمانی کی سیرۃ النبیؐ کو مکمل کیا اور شبلی نعمانی کی متعدد کتابوں کی اشاعت کا اہتمام فرمایا۔ الندوہ کے مدیر رہے۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ کی بنیاد رکھی۔ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ جاری کیا۔ عربوں کی جہاز رانی، خطبات مدراس، عرب و ہند کے تعلقات، بریدِ فرنگ، سیرۃ عائشہؓ، ارض القرآن، نقوش سلیمانی، وغیرہ آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔
۲۸- سید نذیر نیازی (مترجم)، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، بزم اقبال لاہور، دیباچہ ص ۸۔
۲۹- ''جیسا کہ نور سے علومِ طبیعیہ میں بحث کی جاتی ہے۔'' ترجمہ از سید نذیر نیازی۔ حاشیہ: مکتوبات اقبال بنام سید نذیر نیازی، ص ۴۰۔
۳۰- ''اضافی طور پر مطلق۔'' ترجمہ از سید نذیر نیازی، حاشیہ ایضاً، ص ۴۱۔
۳۱- ایضاً، ص ۴۰-۴۱۔
۳۲- معلوم ہوتا ہے یہاں مولانا جیراج پوری کی ترجمانی کرتے ہوئے سید نذیر نیازی زجاج بہ مفہوم ایمان سہواً لکھ گئے ہیں۔ شاید سننے یا بیان کرنے میں ان سے تسامح ہوا۔ قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ مولانا نے یہاں مصباح کا لفظ بہ مفہوم ایمان، بولا ہوگا ورنہ ان کے بیان میں زجاج کا لفظ دوبار استعمال نہ ہوتا اور مصباح کا لفظ غائب نہ ہوتا۔
۳۳- مکتوباتِ اقبال، ص ۴۲۔
۳۴- ایضاً، ص ۴۳-۴۴۔
۳۵- ایضاً، ص ۴۶۔
36- *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, Oxford University Press London 1934. pp. 60-61.
۳۷- تفصیل کے لیے دیکھیں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تفہیم القرآن، جلد سوم، مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور، ۱۹۹۱، ص ۴۰۷۔
۳۸- ماہنامہ طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۳۸ء، ص ۲۔
۳۹- ایضاً، ستمبر ۱۹۴۰، ص ۳۲۔
۴۰- ایضاً۔ حضرت مولانا جیراج پوری نے دی انٹر کالجیٹ مسلم برادر ہڈ کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کے ''یوم اقبال'' کو اولین یوم اقبال قرار دیا ہے۔ ان کے تتبع میں مدیر طلوع اسلام نے نظم ''زندہ رود'' کے تعارفی

نوٹ میں بھی اس یوم اقبال کو اولین یوم اقبال ٹھہرایا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ پہلا یوم اقبال خواجہ عبدالوحید (۱۹۰۱-۱۹۷۹) اور ان کے احباب کی کوششوں سے ۶ ستمبر ۱۹۳۲ء کو یونی ورسٹی ہال لاہور میں منعقد ہوا اور اس کی کارروائی ۷ ستمبر ۱۹۳۲ء کے روزنامہ انقلاب لاہور میں شائع ہوئی۔ تفصیل کے لیے دیکھیں مجالس اقبال (مرتب: جعفر بلوچ)، دارالتذکیر لاہور، ۲۰۰۱، ص ۱۴۱ تا ۱۴۳۔